سہرورد

سلسلہ نمبر ۲

بہاؤالدین ملتانی کنند ہر دم ثناء خوانی
محی الدین جیلانی محی الدین جیلانی



— زیرِ نگرانی —

محمد نذیر غوری ہجویری سہروردی

سہروردیہ فاؤنڈیشن (ٹرسٹ) کا ترجمان

سہرورد

بیاد

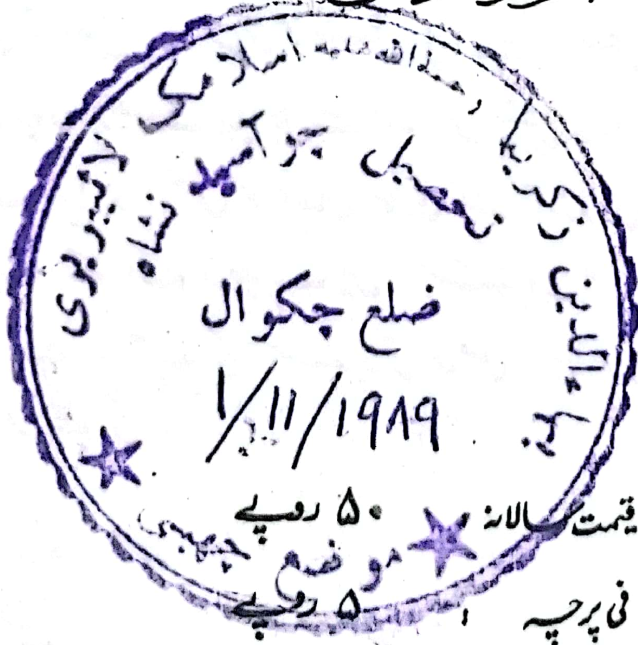
حضرت شرف الدین بابا جنگوشاہ قلندر قدس سرہ

مجمع الکاملین حضرت میاں غلام محمد سہروردی

مجدد سلسلہ سہروردیہ حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی

سلسلہ نمبر 2

فہرست



قیمت سالانہ ۵۰ روپے

فی پرچہ ۵ روپے

رابطہ: فنون پریس، ۳۵ رائل پارک لاہور پاکستان فون: ۲۲۲۷۸۴

گفتگو

"سہروردؔ" کا نقشِ اوّل پیش کرتے ہوئے ایک جھجک سی دامن گیر تھی ہمیں اپنے ذرائع کی کمی کے ساتھ ساتھ موضوع کی نزاکت کا بھی پورا احساس تھا خدشہ تھا کہ شاید یہ کاوش علم کی بلند معیار کسوٹی پر پوری نہ اُترے ...... لیکن شکر ہے ربِّ لم یزل کا ...... کہ ہماری اس ادنیٰ علمی کوشش کو آپ کی نگاہِ انتخاب نے پسند فرمایا ۔ ہم ان احباب کے بطورِ خاص مشکور ہیں ، جنہوں نے "سہروردؔ" کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت ، زیادہ سے زیادہ مستند، اور اپنے دائرے میں زیادہ سے زیادہ مکمل بنانے کے لئے اپنی تجاویز اور مشوروں سے نوازا ۔

"سہروردؔ" نے اپنے سفر کا ابھی آغاز ہی کیا ہے ۔ اگر آپ کی رہنمائی اسی طرح حاصل رہی ، تو انشاءاللہ علم کے راستوں پر اس کا سفر بہاروں کا سفر ثابت ہو گا اور بعد میں آنے والے منزلِ تصوف و روحانیت کے مسافر سہروردؔ کے نقوشِ پا کو رہِ مستقیم پر اپنی جادہ پیمائی کے لئے سنگِ میل قرار دیں گے ۔

نقشِ اوّل کی پذیرائی کے بعد نقشِ ثانی پیشِ خدمت ہے ۔ ہم نے اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ کوشش کی ہے کہ نقشِ ثانی کو نقشِ اوّل کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت بنایا جا سکے تاکہ اس نقشِ لازوال کی جانب ہماری پیش قدمی کا ثبوت مہیا ہو ۔ جس کا وصال ہماری تشنہ آرزوؤں کا مرکز و محور بن چکا ہے ۔ مادیت کے اتھاہ اندھیرے میں "سہروردؔ" روشنی کی ایک کرن بن کر نمودار ہوا ہے ۔ آپ کی سرپرستی حاصل رہی تو یہ کرن ایک دن ضرور آفتاب بن کر چمکے گی ۔

ظفر علی راجا

جہانے را دگرگوں کرد
یک مردِ خود آگاہے

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ۔ حیات و خدمات

سید عبدالرحمٰن بخاری

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف
خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
(اقبالؒ)

روح عصر کی پکار اقبالؒ کے ان الفاظ میں جھلکتی ہے :۔

" Humanity needs three things today– a spiritual interpretation of the universe, spiritual emancipation of the individual and basic principles of universal import directing the evolution of human society in the spiritual basis ". 1

---

(1) The reconstruction of religious thoughts in Islam (Page: 183)

یعنی عالم انسانی کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کا روحانی استخلاص، اور وہ بنیادی اصول[2] (محکمات — باصطلاحِ قرآنی) جن کی نوعیت عالمگیر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقاء روحانی اساس پر ہوتا رہے۔

کہنے کو تو یہ ایک ہی فقرہ ہے لیکن حقائق و معانی کا ایک بحر ناپید اکنار، جو نابغۂ عصر کے برسوں پر محیط انفس و آفاق کے اندر غور و خوض، حیات و کائنات کے مطالعہ و تجزیہ اور فکر و پیغام کا محرک و حاصل ہے۔ اس میں ایک طرف کائنات کی ماہیت و اصلیت انسانیت کی غائیت و منتہائے زیست اور زندگی کی عالمگیر ابدی اقدار کے حوالے سے نوع انسانی کے دوش و فرد اکی نقشہ کشی کی گئی ہے تو دوسری جانب اقوام و امم کے علاج واسباب کے اسباب و عوامل کی نشاندہی اور ادیان و مذاہب کی حقیقت و رد سے نقاب کشائی کی گئی ہے۔

یہاں تین امور قابل غور ہیں۔ اول یہ کہ کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کے روحانی استخلاص اور آفاقی نوعیت کے ابدی اصولوں سے کیا مراد ہے؟ اور ان کا سرچشمہ کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ آیا فی الواقع عالم انسانی کو آج ان کی ضرورت ہے؟ اور اگر ہے تو کیا یہ احتیاج آج کہیں خارج سے ابھری ہے یا شروع سے بنی آدم کی ذات و فطرت کا تقاضا رہا ہے؟ تیسرا غور طلب امر یہ ہے کہ ان کی اس بنیادی ضرورت کی تکمیل اور ان تینوں چیزوں کی تحصیل کا حقیقی ذریعہ اور طریق کیا ہے؟ ان امور پر گہرے فلسفیانہ غور و خوض اور تفصیلی بحث و مطالعہ کا یہ موقع نہیں۔ یہاں ہم ان تینوں اشیاء کے سرچشمہ، حیات انسانی کے ساتھ ربط و علاقہ اور ذرائع تحصیل و تکمیل کا، ایک خاص عصر و ماحول اور ایک "عہد آفریں ہستی" کے انقلابی کارناموں کے حوالے سے اجمالی مطالعہ کریں گے۔

جس طرح یہ امر کالشمس ہے کہ کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کا روحانی استخلاص اور روحانی اساس پر ارتقائے معاشرہ کے بنیادی اصول، نوع انسانی کا منتہائے مقصود، اور اولین ضرورت ہیں۔ اسی طرح اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ان تمام اشیاء کا ماخذ و منبع اور سرچشمہ صرف اور صرف "دین و مذہب" ہے اور اگر اس ناقابل تردید حقیقت کا علی وجہ البصیرت ایقان و اذعان درکار ہو تو جادۂ زیست پر، انسان کے صدیوں پہ محیط فکری ارتقاء کے سفر میں، عقل کوتاہ دست کی پیہم چیرہ دستیوں اور نت نئے تجربات

کی بھٹی میں بار بار پگھلنے کے باوصف ہنوز پراگندہ خیالی ، بے حاصلی اور تلاشِ حقیقت میں سرگرداں
کی ایک ہلکی سی جھلک پرویز (غلام احمد) کی کتاب "انسان نے کیا سوچا" میں دیکھی جاسکتی
ہے ۔ بہر آئینہ اس واشگاف حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ اگر یہ تینوں چیزیں انسان کو
میسر آسکتی ہیں تو صرف "دین و مذہب" کی بارگہ سے ...... آئیے ! آگے بڑھیں اور
یہ دیکھیں کہ دین کا انسانی زندگی کے ساتھ کیا تعلق اور رشتہ ہے ؟ (کیونکہ اس تعلق کی وضاحت
سے حیاتِ انسانی کے لئے ان تینوں چیزوں کی اہمیت و ضرورت بھی کھل جائے گی) دین
اپنی حقیقت و ذات کے اندر ان "لوازماتِ ثلاثہ" کو کیونکر سموئے ہوئے ہے ؟ اور نوعِ انسانی
کو یہ تینوں چیزیں (لوازماتِ ثلاثہ) بالاستمرار ہر عصر و عہد میں مہیا کرتے رہنے کے لئے دین[1]
نے کیا اہتمام و انصرام کر رکھا ہے ؟

دین اور حیاتِ انسانی

ع ثباتِ زندگی " ایمانِ محکم " سے ہے دنیا میں

انسان صرف جسدِ ظاہری (Physical body) سے عبارت نہیں بلکہ اس میں
جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے ۔ جسے "ذات" (PERSONALITY) کہتے ہیں۔
قرآنی اصطلاح میں یہ روح (SOUL) کہلاتی ہے ۔ فطرت کے قانونِ نشوونما (LAW OF
DEVELOPMENT) جو کائنات کے قطرے قطرے اور ذرّے ذرّے میں جاری و ساری
ہے ، کے مطابق انسان فطری طور پر ہمہ جہتی ارتقاء اور بالیدگی کا محتاج ہے ۔ جسم و ذات کا
فطری ، مکمل اور ہم آہنگ ارتقاء اس کا آئیڈیل ہے ۔ قرآن کریم اسے حسناتِ دنیوی اور
حسناتِ اخروی[2] کی تحصیل سے تعبیر کرتا ہے ۔ عالمِ اسباب میں جس طرح جسمِ انسانی کی نشوونما
کے لئے غذا کی ضرورت ہے ۔ اسی طرح ذاتِ انسانی کی نشوونما اور بالیدگی کے لئے روحانی

۱۔ یہاں یہ حقیقت دل نشیں رہنی چاہیئے کہ دین سے مراد فقط "اسلام" ہے " ان الدین عند اللہ الاسلام " (القرآن) اسلام کے علاوہ دنیا میں اور کوئی مذہب عند اللہ اور نفس الامر کے اعتبار دین نہیں - لہٰذا غلط مبحث نہ ہونے پائے ۔ (بخاری)

۲۔ ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ ۔ الخ (البقرہ)

اقدار (Spiritual Values) جن کا مجموعہ دین ہے، کی ضرورت ہے اور دین کی غائیت ومنتا بھی نشوونمائے ذات ہے۔ اقبال کہتے ہیں "مذہب کی اصل غائیت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لئے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے"۔ یہی وجہ ہے کہ دین بحیثیت دین انسانی فطرت کا بنیادی تقاضا اور ہمیشہ سے حیات انسانی کا جزو لاینفک رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر دور اور ہر ملک و قوم کے ہاں دین کا مفہوم، نوعیت اور شکل وصورت مختلف رہی لیکن بنیادی طور پر ہر عہد اور نوع انسانی کی ہر نسل میں دین کی اساسی اقدار کا سراغ ملتا ہے۔ تاریخ انسانی میں کوئی معاشرہ، کوئی تمدن، اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو مذہب سے کلیتہً بے نیاز رہی ہو۔ پلوتارک نے بالکل صحیح کہا ہے کہ کسی انسان نے کوئی ایسی بستی نہیں دیکھی۔ جس میں مذہب نہ ہو[2]۔ اس بات کی مزید وضاحت (H.B. TYLOR) کی پیش کردہ مذہب کی تاریخ سے ہو جائے گی کہ "مذہب روحانی موجودات پر اعتقاد کا نام ہے" یا سینٹ تھامس کی یہ تعریف کہ "مذہب خدا سے تعلق کا نام ہے"[3] مذہب کی اس عمومیت کی اساس وبنیاد سے آگاہ کردے گی۔ یہی وجہ ہے کہ معروف فرانسیسی مفکر آگست کومت نے فکر انسانی کو تین ادوار میں منقسم کیا ہے۔ مذہب اس فکر کا دور اولین ہے۔ دوسرا دور فلسفیانہ یا مابعد الطبیعاتی ہے اور تیسرا سائنسی، مذہب کی اہمیت کے سلسلہ آرنلڈ ٹوائن بی کا یہ قول انتہائی اہم ہے۔

"RELIGION WAS INDESPENSIBLE FOR HUMAN BEINGS AND WITHOUT IT EXISTENCE OF MAN WAS NOT POSSIBLE."[4]

دین کی حقیقت وماہیت

دین کی تعریف کرنے میں حکمائے قدیم وجدید کے مابین کافی اختلافات رونما ہو گئے ہیں۔

۱۔ مقالات اقبال، ص ۱۲۴

2 - Humanity and Piety - by W. M. URBAN

3 - Quoted by JULIAN HUXLEY in "RELIGION WITHOUT REVELATION

4 - The Islamic Review, London, Jan 1960

ہر شخص نے ایک مخصوص پس منظر میں ایک مخصوص فکر پر مبنی تعریف پیش کی ہے (ان تعریفات کا جائزہ لینا یہاں غیر متعلق ہوگا[1]) تاہم اکثر تعریفات، بالخصوص مسلم مفکرین کی پیش کردہ تعریفات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ دین عبادت ہے۔ عقیدہ وعمل کے حسین امتزاج سے بقول امام ابوحنیفہؒ لفظ دین کا اطلاق ایمان، اسلام اور جملہ احکام شرعیہ پر ہوتا ہے[2] (امام عبارت ہے عقائد سے، اور اسلام جملہ اعمال شرعیہ کو محیط ہے) سید شریف جرجانی کے نزدیک 'دین اللہ' کا مقرر کردہ دستور حیات ہے جو اصحاب عقل و فکر کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ لائحہ عمل کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے[3]۔

پروفیسر وہائیٹ ہیڈ نے مذہب کی جو تعریف کی ہے۔ وہ اس کی حقیقت اور غائیت کا واضح سراغ دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔" مذہب اعتقاد کی اس قوت کا نام ہے۔ جس سے انسان کی اندرونی پاکیزگی ہوتی ہے"۔

یعنی مذہب ان صداقتوں کے مجموعے کا نام ہے۔ جن میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ انسانی کردار میں انقلاب پیدا کر دیں۔ جب انہیں خلوص کے ساتھ قبول کیا جائے اور بصیرت کے ساتھ سمجھا جائے[4]۔" اقبالؒ بھی یہی کہتے ہیں کہ "عقیدہ جب مذہب کے رنگ میں دل پر قبضہ پالیتا ہے تو انسان کے عمل میں عجیب و غریب حرارت پیدا کرتا ہے[5]"۔ اور یہی ہے مذہب کا وہ حرکی تصور، جو برگسان نے اپنی معروف کتاب " مذہب اور اخلاق کے دو ماخذ " میں پیش کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مذہب کا ایک ماخذ تو انسان کا اسطور سازی کا جذبہ ہے لیکن اس طرح کا مذہب ایک جامد نوعیت کا ہوتا ہے۔ جس میں زمانے کے ساتھ بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس کا کام محض سلبی ہوتا ہے۔ وہ انسان کو مایوسی اور دل گرفتگی سے بچاتا ہے لیکن دوسری قسم کا مذہب (اور اسی کو برگسان حرکی، کا نام دیتا ہے) متصوفانہ واردات اور تجربے کا نتیجہ ہے

۱۔ پرویز نے اپنی کتاب " انسان نے کیا سوچا ؟" کے باب فہم میں مغربی مفکرین کی پیش کردہ تعریفات کا کافی حد تک استفادہ کر لیا ہے۔ ۲۔ امام ابوحنیفہؒ، الفقہ الاکبر مع شرح ملا علی قاری صفحہ ۹

۳۔ الجرجانی۔ کتاب التعریفات ص ۴۳

4 Quoted by Aldous Huxley - in ENDS AND MEANS (P: 250)

۵۔ گفتار ص ۲۶۴

اس کا کام محض انسان کی ذات کا تحفظ نہیں بلکہ اس کی روحانی زندگی میں ایک نئی وسعت اور گہرائی پیدا کرنا ہے۔ جس کے باعث وہ اعلیٰ درجے کی مخلوق بن جاتا ہے[1]۔ برگسان کے اس حرکی تصور سے مذہب کے بنیادی وظیفہ وکردار اور غائیت مقصود کا واضح پتہ چل جاتا ہے۔ یعنی نشوونمائے ذات انسانی، جسے ہم ابتدا ہی میں بصراحت بیان کر آئے ہیں۔ درحقیقت حیات انسانی کی تعمیر اور سیرت انسانی کی تشکیل ہی وہ ذریعہ ہے۔ جس سے دین، انسان اور خدا کے درمیان دوئی (جدائی) کی خلیج پاٹنے میں رہنمائی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین کی اصل وغائیت اور تمام انبیاء کرام کی بعثت کا اصل مقصود "تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب" ہے۔ جیساکہ قرآن کریم کی بیشمار آیات سے صراحت ہوتی ہے۔ مثلاً ..... یعلمهم الكتب والحكمة ويزكيهم الآية اور قد افلح من تزكى" وغیرہ اور یہی وجہ ہے کہ تزکیہ کا عمل انسانی معاشرے کے کسی خاص گروہ تک محدود نہیں بلکہ اس کا تعلق پورے معاشرے کے ساتھ یکساں طور پر ہے۔ دین میں اس کی حیثیت ایک 'فضیلت' کی نہیں بلکہ ہر شخص کے لئے ایک لازمی انفرادی ضرورت کی ہے۔ یہاں پہنچ کر دین اور تصوف کا باہمی رشتہ اور دین کے واسطے سے زندگی کے ساتھ تصوف کا رابطہ وعلاقہ کو واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے اور ساتھ ہی حیات انسانی کے لوازمات ثلاثہ (کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کے روحانی استخلاص اور عالمگیر ابدی اصول) کی اساسی اہمیت بھی آشکار ہو جاتی ہے۔

ع ثبات زندگی "ایمان محکم" سے ہے دنیا میں (اقبالؒ)

دین اور تصوف

ع پس طریقت چیست اے والا صفات
شرح را دیدن با عماق حیات (اقبالؒ)

اوپر بیان ہوا ہے کہ مذہب یا دین اپنی حقیقت کے لحاظ سے زندہ خدا کے ساتھ زندہ رابطہ پیدا کرنے کا نام ہے اور یہ رابطہ تصوف ہی کی بدولت پیدا ہو سکتا ہے۔ پس تصوف مذہب کی روح ہے۔ بحیثیت علم وفن کے، تصوف کی تعریف میں زمانہ قدیم وجدید کے اکابر

۱۔ برگسان۔ مذہب واخلاق کے دو ماخذ۔ باب ۳۔ نیز جان اے نکلسن، فلسفہ مذہب، باب ۷، ص ۹۲۔

صوفیا کے بے شمار اقوال ملتے ہیں۔ ان سب کا استقصاء غیر ضروری ہے لیکن ان پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو ان سب کا حاصل وہی نظر آتا ہے جو شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ نے تصوف کی جامع و مانع تعریف میں کر دیا ہے۔

"التصوف ہو علم تعرف بہ أحوال تزکیۃ النفوس وتصفیۃ الأخلاق وتعمیر الظاہر والباطن لنیل السعادۃ الأبدیہ ، موضوعہ التزکیۃ والتصفیۃ والتعمیر وغایتہ نیل السعادۃ الابدیۃ"[1]

یعنی تصوف وہ علم ہے۔ جس سے تزکیہ النفوس، تصفیہ اخلاق، تعمیر ظاہر و باطن کے احوال کا علم ہوتا ہے تاکہ سعادت ابدی حاصل کی جا سکے۔ اس کا موضوع بھی تزکیہ، تصفیہ اور تعمیر ظاہر و باطن ہے اور اس کی غائیت و مقصد سعادت ابدی کا حاصل کرنا ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ دین کی اصل و غائیت ہے تزکیہ نفس اور تصفیۂ قلب اور یہاں ثابت ہو گیا کہ تصوف کی حقیقت بھی یہی تزکیہ و تصفیہ ہے۔ یوں دین اور تصوف یکساں جان ٹھہرے۔ اقبالؒ کہتے ہیں

"شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے"[2]۔

یوں تصوف دین اسلام کی خالص ترین اور پاکیزہ ترین تعبیر ہے۔

اک شرح مسلمانی ، اک جذب مسلمانی
ہے جذب مسلمانی ، سرِ فلک الافلاک (اقبالؒ)

اسلامی معاشرے میں تصوف کی احتیاج

دگر آئین تسلیم و رضا گیر   طریق صدق و اخلاص و وفا گیر (ارمغان حجاز)

صحیح مذہب انسان کے تمام داعیات کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اس میں جہاں عقل و دانش کے سرچشموں کو کبھی خشک نہیں ہونے دیا جاتا، وہاں جذبات عمل کے داعیات کی تسکین کا سامان بھی موجود ہوتا ہے۔ مذہب کا ابتدائی اور انسانی زندگی کی تشکیل و تعمیر کا دور

۱۔ ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری۔ "الرسالۃ القشیریۃ" حاشیہ ص۷
۲۔ اقبال نامہ۔ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۲۰۲۔

ہوتا ہے لیکن اس تخلیقی دور کے بعد مذہب کے انفرادی اور سماجی اعمال ایک منظم معاشرتی تمدن کی صورت میں متشکل ہو جاتے ہیں اور عوام کی زندگی کچھ اس نہج پر بسر ہونے لگتی ہے کہ وہ ان اعمال کی پیروی محض ایک میکانکی طریقے پر کرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جس سے انسان کے قلب میں ایک روحانی خلاء محسوس ہوتا ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل؟
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

اس خلا کو پُر کرنے کے لئے تصوف کا دور شروع ہوتا ہے جو گویا مذہب کا روحانی دور کہلا سکتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں تصوف کا تقاضا اس وقت ابھرا تھا جب سلاطین کی نوازشات کی بدولت انہیں خوش کرنے کے لئے علمائے سُو نے تشرع یعنی لفظ قانون کی پیروی کا نقطۂ نظر اختیار کیا تھا۔ اتباع شریعت میں خلوص نابود ہونے لگا تھا۔ لہذا صوفیائے کرام نے طریقت کو اس مقصد کے لئے رواج دیا کہ احکام شرح کی پیروی میں اخلاص پیدا ہو اور سیرت عروج پذیر رہے۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ نفس انسانی، اسلامی معاشرے اور ثقافت و ثقافتی اداروں میں تصوف یا صوفیانہ و مذہبی واردات کی احتیاج کیا ہے؟

نفس انسانی کے اندر مذہبی واردات کی احتیاج

جب عقیدہ (ایمان)، علم اور عمل ایک دوسرے سے ناسازگار ہو کر سیرت کو اختلال میں مبتلا کر دیں تو سیرت کو دوبارہ منضبط اور منقاد بنانے کے لئے مذہبی واردات کا حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی زندگی واقعی اور مثالی فطرت کے تضادات کا مجموعہ ہے۔ واقعی یا بالفعل فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد بغیر کسی قید اور ضابطے کے حاصل کرے۔ جس کا لازمی نتیجہ بے نظامی اور بے انقیادی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مثالی یا بالقوہ فطرت کو نشوونما دے کر اس کے تحت بالفعل فطرت کو ضبط و انقیاد کا پابند بنایا جائے یہ ضبط و انقیاد صرف قانون کو جاننے یا لفظ قانون کی پیروی سے نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس کے لئے اخلاقی سیرت کو ایک معیار کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے۔

روحانی واردات کی احتیاج معاشرے میں

معاشرہ ایسے افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ جن کا مقصود ایک ہو۔ جن کے کردار میں یکسانی پائی جائے اور وہ یکسانی اسے یہ شعور فراہم کرے کہ عمرانی اعتبار سے ہم ایک ہیں۔ معاشرتی زندگی کا مظہر وہ سوشل ادارے ہیں۔ جن کے ذریعہ اسلام افراد اور جماعت کو ان مقاصد تک پہنچانا چاہتا ہے۔ مثلاً۔ خاندان، مدرسہ، مسجد، بیت المال، ریاست وغیرہ۔ ان میں سے ہر ادارے کو منضبط اور منظم رکھنے کے لئے ایک ضابطہ ہے لیکن صرف ضابطے کا معلوم ہونا اس کا ضامن نہیں ہو سکتا کہ ادارے اور ارکان ادارہ کا طرز عمل معیار کے مطابق ہو گا۔ اس کے لئے تزکیہ، یعنی انحراف کے میلانات پر قابو پانا ضروری ہے اور یہی معاشرہ کے اندر صوفیاء نے واردات کی احتیاج کی بنیاد ہے۔

ثقافت میں صوفیانہ واردات کی ضرورت

ثقافت یا کلچر (CULTURE) قرآنی اصطلاح نہیں بلکہ ایک خالص مغربی اصطلاح ہے۔ قرآن کریم نے اس مفہوم میں 'ملت' کی اصطلاح برتی ہے۔ فرمایا۔ "ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سمکم المسلمین" (القرآن) 'ملت' دراصل معمول بہٗ دین کا نام ہے اور معمول بہ دین میں اس کا بھی امکان ہے کہ کوئی امت بے راہروی اختیار کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک معیاری دین ہو۔ جس کے حوالے سے معمول بہ دین کا رُخ صحیح کیا جاتا رہے اور یہی ہے ثقافتی زندگی میں صوفیانہ واردات کی احتیاج کی اساس۔

سیاسی زندگی میں مذہبی واردات کی احتیاج

اگر منظم معاشرے میں ریاست کے وجود میں آنے کے بعد حکمران طبقہ کی روحانی اصلاح نہ ہوئی ہو تو وہ اپنے اقتدار سے اسلام کے تقاضے پورے کرنے کے بجائے 'ہوس اقتدار' کے تقاضے پورے کریں گے۔ اس لئے سیاسی زندگی کو صحیح رکھنے کی خاطر بھی مذہبی واردات کی احتیاج لازم

آتی ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں اسلامی معاشرے اور مختلف معاشرتی اداروں نیز نفس انسانی کے اندر تصوف یا مذہبی واردات کی احتیاج کا یقینی سراغ مل جاتا ہے۔ جو اثبات کیا گیا ہے۔ یہ دراصل ابتدائے بحث میں دیئے گئے اقبال کے ایک فقرے میں پیش کردہ عالم انسانی کے لوازمات ثلاثہ یعنی کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کے روحانی استخلاص اور عالمگیر ادبی، روحانی اصولوں کی احتیاج والادیت کا اثبات وتحقق ہے۔ اب آگے ہم یہ دیکھیں گے کہ ان لوازمات ثلاثہ یا بالفاظ دیگر اب دیکھنا یہ ہے کہ تصوف اور مذہبی واردات کی تحصیل وتکمیل کے ذرائع ووسائل اور طرق کیا ہیں؟ اور دین نے بالاستمرار تغیر پذیر زندگی کے ہر مرحلہ پر نفس انسانی، معاشرے اور سماجی وسیاسی زندگی کی اس "احتیاج تصوف وروحانیت" کی تکمیل کا کیا اہتمام وانتظام کر رکھا ہے؟ اس سوال کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ "دین از نظر۔ یا

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

محض شاعرانہ تعلی یا عقیدت مندانہ مبالغہ آرائی نہیں بلکہ اوپر کی ساری بحث کا تجزیہ کرنے سے حقیقت یہ ہی کھلتی ہے کہ دین کی غرض وغایت اصلی بھی تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب ہے اور تصوف یا مذہبی اور روحانی واردات کی اصلیت وحقیقت بھی یہی تزکیہ وتصفیہ ہے۔ ادھر قرآن کریم نے تزکیہ وتصفیہ کا یہ وظیفہ منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین، خاص کر رحمۃ للعالمین معلم انسانیت کی ذات گرامی کو سونپا ہے۔ دعائے ابراہیمی میں بھی نبی کل کائنات کو یہی مشن سونپنے کی استدعا کی گئی تھی "ربنا وابعث فیھم یتلوا علیھم آیتک ویعلم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم"۔ اجابت دعا اور بعثت رسول پر رب العزت نے مومنین پر اپنا احسان عظیم جتلاتے ہوئے بھی سرور انبیاء محبوب خدا کے اسی منصب پر فائز اور اسی مشن پر مامور بتلایا گیا۔ "لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم الآیۃ اس طرح بیشتر مقامات پر اللہ تعالیٰ نے رسالت آب صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب ومشن اور مقصد بعثت یہی تزکیہ نفس وتصفیہ اخلاق بتایا ہے۔ نیز خود رسالت آب صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی تصریح فرمائی ہے۔ بعثت لا تمم مکارم الاخلاق"۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ بعد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ابعد یہ تزکیہ نفوس وتصفیہ قلوب کا منصب کس کو سونپا گیا ہے؟ اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کی بجائے میں ایک دو آیات

قرآنی اور احادیث نبوی علی صاحبہا التحیہ سے استدلال پیش کر دیتا ہوں ۔ حقیقت وا شگاف ہو جائے گی ۔

حدیث نبویؐ ہے کہ " العلماء ورثۃ الانبیاء " کہ نبی کے وارث منصب علماء ہی ہوتے ہیں ۔ اب علما کون ہیں ؟ اس کی تصریح قرآن کریم میں ہے کہ " انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء " یعنی علماء وہ لوگ ہیں جو سب سے زیادہ خدا کی خشیت ، خوف اور تقویٰ اپنے دل میں رکھتے ہیں ۔ انہی لوگوں کو دوسرے مقام پر تقویٰ سے متصف کرتے ہوئے فرمایا ۔ " الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ھم یحزنون ، الذین آمنو وکانو یتقون " یعنی اللہ کے ولی ، دوست وہ جوگ ہیں جو ایمان اور تقویٰ کے حامل ہیں ۔ ان کے لئے دنیا اور آخرت میں کوئی خوف وغم نہیں ۔ یوں بھی علم بغیر عمل کے مردود ہے ۔ " لم تقولون مالا تفعلون " اور عالم باعمل ہی ولی ہوتا ہے ۔ اور عالم باعمل یعنی ولی ہی منصب نبوت (تزکیہ نفوس اور تصفیۂ قلوب) کا حامل ہے ۔

یوں بھی یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کرنے کے لئے پہلے مزکی کا خود صاحب تزکیہ ہونا ضروری ہے ۔ جس کا اپنا دل ونفس مزکیٰ ، منقیٰ نہیں ، وہ کیونکر دوسروں کا تزکیہ نفس کر سکتا ہے ۔ پس جو لوگ خود صاحب تزکیہ یعنی اولیاء اللہ ہیں ۔ وہی اس منصب نبوت کے عالی مقام حاملین ہیں ۔ بالالفاظ دیگر دین اور مذہبی وروحانی واردات کی تحصیل وتکمیل کا رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور ختم نبوت کے بعد ، واحد ذریعہ و وسیلہ اور ماخذ وسرچشمہ ، وہ باکمال نفوسِ قدسیہ ہیں ۔ جن کا تقویٰ دیانت ، خلوص اور پاکیزگی تاریخی مسلمات سے ہوں اور جو علوم شرعیہ ظاہریہ اور علوم طریقت وباطنیہ کے بحر زخار ہوں ۔ اصطلاح شریعت میں ایسے ہی افراد کو " اولیاء اللہ " کہا جاتا ہے ۔

دم عارف نسیم صبحدم ہے — اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آنے میسر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے (اقبالؒ)

دین اور نفوس قدسیہ

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ، ان کی
الہٰی کیا چھپا ہوتا ہے ، اہلِ دل کے سینوں میں (اقبالؒ)

زندگی ہمہ حرکت اور سراپا تغیر ہے اور تاریخ وزمانہ مسلسل ارتقاء۔ اقبالؒ کہتے ہیں

؎ ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

اس رواں دواں اور سدا جوان زندگی کے بدلتے تقاضوں کا ساتھ دینے اور ارتقاء پذیر انسانی سوسائٹی کی رہنمائی کے لئے آخری سماوی دین ابدی عقائد وحقائق پر استوار ہونے کے باوصف حرکت وحرارت سے بھرپور ہے اور بقول اقبالؒ "اسلام کا باطن حرکت کا متقاضی ہے۔ بلاشبہ اسلام خدا کی طرف سے بندوں کے حق میں کامل ترین اور جامع ترین پیام رحمت ہے۔ ہر عصر وعہد کے انسان کی ذہنی وعقلی، اخلاقی ومعاشری، جسمانی وروحانی، انفرادی و اجتماعی تمام ضرورتوں کا کفیل اور ہر شعبہ حیات میں ترقیوں کا ضامن ہے۔ آخری دین اور آخری امت کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات وانقلابات ہے اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے۔ وہ تاریخ کے گذشتہ کسی دور میں نظر نہیں آتا۔

دین کی بقاء اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات

بدلتے ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے اور زمان ومکان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اللہ تعالٰے نے اس امت کی خاطر دو انتظامات کئے ہیں۔ ایک تو اسلام کی ابدی تعلیمات میں ایسی لچک رکھی ہے۔ کہ وہ ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

؎ اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے۔

اتنا ہی یہ ابھرے گا، جتنا کہ دبائیں گے

اور دوسرے خدا نے اس کا ذمہ لیا ہے کہ وہ اس دین قیم کو ہر دور میں ایسی تاریخ ساز اور انقلاب آفریں شخصیات عطا فرماتا رہے گا جو ان عالمگیر ابدی اقدار کو زندگی میں منتقل کرتی رہیں گی اور انفرادی واجتماعی طور پر اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گی۔ دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا اور تغیر پذیر زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا۔ جب تک اس میں وقتاً فوقتاً ایسے زندہ اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی وایثار اور اپنی اعلیٰ دفاعی وقلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں اور اس کے ماننے والوں میں نیا جوش، اعتماد اور قوت عمل پیدا کر دیں۔ اس لئے بھی کہ تکمیل دین اور

ختم نبوت کے بعد پیغمبرانہ اصلاح کا منصب " وارثان نبوت " کو سونپا گیا ہے۔

اسلام کے قلب وجگر پر حملے

شروع ہی سے اسلام کے قلب وجگر اور اعصاب وحواس پر ایسے حملے ہوئے کہ کوئی دوسرا مذہب ان کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ ایک طرف باطنیت اور ان کی شاخیں اسلامی روح اور اس کے نظام عقائد کے لئے سخت خطرہ تھیں تو دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لئے صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کا حملہ کافی تھا لیکن اسلام نے ان سب داخلی اور خارجی حریفوں کو شکست فاش دی اور اپنی اصلی منزلہ شکل میں قائم رہا بلکہ کارگہ زیست میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی اسلام کے لئے کوئی فتنہ نمودار ہوا۔ کوئی نابغہ روزگار شخصیت ایسی ضرور میدان میں آگئی۔ جس نے اس فتنہ کا پوری قوت سے مقابلہ کیا اور اس کو میدان سے ہٹا دیا۔ دین کی حفاظت ونصرت کی یہ جدوجہد، تجدید وانقلاب کی یہ کوشش اور دعوت واصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی اسلام کی تاریخ اور ایسا ہی مسلسل ہے جیسی مسلمانوں کی زندگی۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز   چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید   ایں دو قوت از حیات آید پدید
نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری   (اقبالؒ)

مطالعہ تاریخ کے نئے رُخ

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں، اپنی آستینوں میں

تاریخ کے طلباء نے شاہی خاندانوں کے عروج وزوال کی داستانوں میں اپنے آپ کو کچھ اس طرح گم کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک تاریخ صرف دربار شاہی اور میدان جنگ ہی سے عبارت ہو کر رہ گئی ہے۔ مذہبی تذکرہ نگاروں نے ان نفوس قدسیہ کی حیات وسیرت پر کچھ اس انداز

سے لکھا کہ ان کے خدوخال ہی چھپ گئے ۔ ماحول کے صحیح پس منظر کے ساتھ نہ ان کو دیکھا جا سکا اور نہ انسانیت کی سطح پر ان کی بزرگی کا اندازہ لگایا جا سکا۔ ستم تو یہ کہ جب بھی ان بزرگوں کے کارناموں کا مطالعہ کیا گیا تو تعصب اور تنگ نظری کی عینک لگا کر ۔ نتیجہ یہ کہ ان نفوس قدسیہ کی سوانح حیات بے مہری زمانہ کے گرد و غبار سے اٹ گئی یا کرامات کی چند بے معنی داستانوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ان صوفیائے کرام کے حالات بنی نوع انسان اور ملت کی ضروریات کے آئینہ میں دیکھے جائیں تاکہ ان کے صحیح خط و خال نمایاں ہو سکیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت ایک مذہبی تحریک کے اسلام کا مطالعہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے بعد انہی نفوس قدسیہ کی حیات طیبہ کے گرد گھومتا ہے ۔ اس طرح یہ بزرگ اسلام کی دینی تاریخ کا جزو لاینفک بن گئے ہیں ۔ ان کی سیرت اور کارناموں کے مطالعہ کے بغیر نہ صرف یہ کہ اسلام کی مذہبی تاریخ میں ایک بہت بڑا خلاء رہ جاتا ہے بلکہ اسلام کی دینی نشو و نما کا صحیح مطالعہ ناممکن ہو کر رہ جاتا ہے ۔

سرمایۂ ملت کے نگہبان

یورپ کے مستشرق اسلام کا مطالعہ کر کے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ مسلمانوں کا سیاسی زوال کبھی ان کے دینی نظام کو تباہ نہ کر سکا بلکہ بقول پروفیسر ہٹی (HITTI) " اکثر ایسا ہوا کہ سیاسی اسلام کے تاریک ترین لمحات میں مذہبی اسلام نے بعض نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں [1] "۔ ہالینڈ کے ایک فاضل (FREDE LOKKEGAARD) نے دبے انداز میں اس بات پر استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ " اسلام کا سیاسی زوال بارہا ہوا لیکن روحانی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا [2] "۔

پروفیسر ٹی ۔ ڈبلیو ۔ آرنلڈ اپنی مشہور کتاب " دعوت اسلام " (THE PREACHING OF ISLAM) میں رقمطراز ہے ۔

" یہ امر قابل غور ہے کہ اسلام نے اپنے سیاسی زوال اور انحطاط کے زمانے میں بعض نہایت

1 - HITTI - The HISTORY OF ARABS P: 475

2 - Lokkeguard, Islamic Taxation in the classic Period 1950

شاندار روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔"[1]

سیاسی زوال کے زمانے میں اسلام کی مسلسل روحانی ترقی اور فروغ کے اسباب کیا ہیں؟
اس سلسلہ میں انگلستان کے ایک مشہور مستشرق ایچ۔اے۔آر۔گب (GIBB) نے ایک مرتبہ آکسفورڈ یونیورسٹی مجلس کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ "تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا لیکن باایں ہمہ وہ مغلوب نہ ہوسکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیاء کا انداز فکر فوراً اس کی مدد کو آجاتا تھا اور اس کو اتنی قوت اور توانائی بخش دیتا تھا کہ کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی"[2]

پروفیسر گب کی رائے سو فیصد درست ہے۔ مسلمانوں کی ملی زندگی میں جب کوئی مشکل مقام آیا تو ان ہی بزرگوں نے بصیرت و حکمت کے ساتھ ناساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اسلام کو اس طرح سنبھالا دیا کہ ایک طرف تو ملت اسلام کی تصوف اور مذہبی واردات کے ذریعہ شاہراہ اسلام پر استقامت و ثابت قدمی نصیب ہوئی اور دوسری طرف اکناف و اطراف عالم میں اسلام کا حیات بخش پیغام رشد و ہدایت گونجا۔ ان نفوس قدسیہ کا ہاتھ ملت کی نبض پر اور ان کا دماغ تجدید و احیاء کی تدبیریں سوچنے میں مصروف رہتا تھا۔ یہ لوگ دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانے کے معزز ترین افراد تھے۔ موثر اور دلآویز شخصیتوں کے مالک یہ حضرات اپنے سینے میں پارے کی طرح بے تاب دل رکھتے تھے۔ یقین ان کا ایمان اور عشق ان کی سپر تھی۔ یہ نفوس قدسیہ اسلام کی عظمت و سربلندی کے لئے کبھی برق بن کر رزمگاہ میں کودے اور کبھی جمال خداوندی کا مظہر بنے۔ قریہ قریہ دعوت حق دیتے پھرے۔ اپنے فیضان نظر سے گم گشتگان بادیہ ضلالت کو صراط مستقیم پر گامزن کیا اور اقوام و ملل کی تقدیروں اور تاریخوں میں انقلاب برپا کردیا میر خورد نے سچ کہا ہے۔

دعا فوالدین اللہ حضا مؤیدا   وَسنة من سیئتہٖ خیر مرسل

اب تک کی پیش کردہ معروضات اور بحث و غور کا حاصل یہ ہے کہ (نوع انسانی کی بنیادی ضرورت اور لوازمات ذہن ہیں۔ کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کا روحانی استخلاص اور روحانی اساس

۱۔ ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ۔ دعوت اسلام، اردو ترجمہ شیخ عنایت اللہ۔ مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور سنہ ۶

۲۔ اسلامی ثقافت۔ ISLAMIC CULTURE ۱۹۴۲ء ص ۲۶۵

پر ارتقائے معاشرہ کے عالمگیر ابدی اصول ۔ ان لوازمات ثلاثہ کا منبع اور سرچشمہ صرف اور صرف دین ہے ۔کیونکہ) " دین نام ہے ابدی اساسی اقدار پر مبنی اس ضابطۂ حیات کا ، جس کے مطابق معاشرہ تشکل کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے "۔ پس دین کی غائت و منشار ہے " نشوونمائے ذات " جسے قرآنی اصطلاح میں تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ اس تزکیۂ قلب اور تصفیہ باطن کی تحصیل تکمیل اور تفویض کا بنیادی ذریعہ اقبالؒ کے الفاظ میں اعتماد اور فیض صحبت سے تعبیر ہے کہ

ع " دین نام ہے اعتماد اور فیض کا "۔ یعنی ، دین از نظر ،

ے دل ازیں سرچشمۂ ہر قوت است

دیں ہمہ از "معجزات" "صحبت" است

اس فیض و ایمان اور اعتماد و ازعان یا بالفاظ دیگر " ترکیۂ نفس " کا منبع و مصدر اور وسلہ و مرکز ہے ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد یہ منصب و مسند آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ۔ علیہ و عملیہ کے وارثان و حاملین ، جنہیں قرآن نے صدیقین ، شہدا اور صالحین کے طبقات میں بانٹ کر رضائے الٰہی و انعامات خداوندی کا مژدۂ جاں فزا سنایا ہے ، کا استحقاق ہے ۔ یوں " نصرت رسول " کا یہ اساسی فریضہ ، جسے قرآن کریم نے " لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ " کے چیلنج اور " ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر الآیۃ " کے حکم میں بیان کیا ہے ۔ انہی نفوس قدسیہ کے ذریعہ تکمیل پذیر ہوتا ہے اور جیسا کہ ہم تاریخی حقائق اور اغیار کے اعترافات کی روشنی میں ثابت کر آئے ہیں ۔ ختم نبوت کے بعد سے اب تک یہ تسلسل اور استمرار ، انہی بزرگوں کے ہاتھوں انجام پذیر ہوتا چلا آیا ہے ۔ فرضی اللہ عنہم و رضوان علیہم ۔

پس آئینہ

اس پس منظر کے بعد اب ہم موضوع زیر بحث کی صلب و گہرائی میں اتر کر ذرا تفصیل سے جائزہ لیں گے کہ تاریخ اسلام کے اس نازک ترین دور میں جب عالم اسلام ایک طرف سے صلیب کی علمبردار طاغوتی قوتوں کے گھیرے میں اور دوسری طرف سیل تاتار کی زد پر تھا ، اور ادھر دینِ اسلام کی پژمردگی ، ناداری اور کس مپرسی کا عالم یہ تھا کہ اپنے بھی بیگانے بن چکے تھے ۔

ع   از خویشاں کسے بیگانہ تر نیست

ایسے میں گیلان کی بستی سے ابھر کر، مرکز اسلام بغداد کے افق سے طلوع ہونے والے ماہتاب شریعت و طریقت، محی الدین، قطب ربانی، غوث الصمدانی، شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ العزیز نے کیونکر تن تنہا اسلام کا پرچم تھاما اور آن کی آن میں خزاں رسیدہ شجر دیں کو سرسبز و شاداب کر دیا؟ دنیائے اسلام میں ایمان اور روحانیت کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ اور ملت اسلامیہ کے ہر شعبۂ حیات میں "پیغمبرانہ انقلاب" برپا کر دیا؟

ے وہ جن کی ارجمندی بھاگئی چشمِ مشیت کو
ہوئی جن کے سپرد ایوان ملت کی نگہبانی

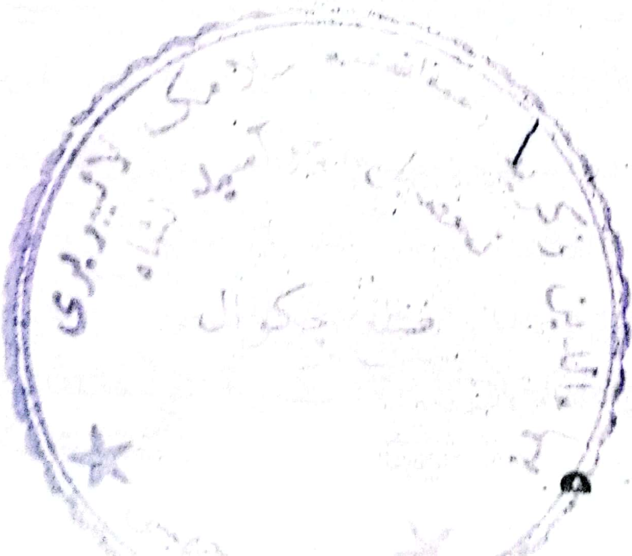
ے زندہ کر ڈالے ہزاروں مردہ دل اک آن میں
جلوہ گر جس دم ہوئے روئے جہاں پر محی دیں "

تاہم، غوث الاعظمؒ کے برپا کردہ عالمگیر روحانی انقلاب کا جائزہ لینے سے پیشتر حصول سعادت و تبرک کے لئے آپ کی حیات و سیرت اور مقام و منصب کا مختصر تذکرہ پیش کیا جاتا ہے۔

ے صحبت او خزف را دُر کند
حکمت او ہر تہی را پر کند

ے ذات او توجیہہ ذات عالم است
از جلال او نجات عالم است

(جاری ہے)



مدرسہ نظامیہ بغداد کا

سرِ معلّم

بغداد ایک عجیب وغریب تاریخی بستی ہے۔ اس نے نوشیرواں کے عدل وانصاف کی بہاریں بھی دیکھیں۔ ہلاکو خان کے قتل عام کی قیامت بھی دیکھی۔ یہاں تخت وتاج کی تقدیر بارہا بدلتی رہی اور لاتعداد سیاسی ومذہبی انقلابات ابھرتے رہے۔ کتب خانوں کو ایندھن کی طرح جلتا ہوا پایا۔ نایاب کتابوں کے باوجود یہ شہر علم وحکمت کی خوشبو سے صدیوں تک مہکتا رہا اور علم وفضل کا مرکز رہا۔ بہت سے علماء اس شہر کے مختلف مدارس سے منسلک تھے۔ یہ شہر عباسیوں کا دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے علوم وفنون کا بہت بڑا مرکز تھا۔

مدرسہ نظامیہ

یہاں کی شہرہ آفاق اسلامی درس گاہ نظامیہ دنیا بھر کے طلباء کا مرجع تھی۔ اس کی بنیاد ۴۵۹ھ میں نظام الملک طوسی نے رکھی۔ اپنے دور میں یہ ساری دنیا کا واحد علمی مرکز تھا۔ کیونکہ یورپ ابھی تک علم سے کورا تھا۔ صرف اندلس میں مسلم یونیورسٹیاں قائم ہو رہی تھیں مگر ان کیلئے ترقی کا معیار نظامیہ بغداد کے نقشِ قدم پر چلتا تھا۔ البتہ نیشاپور کی درسگاہیں قدرے علمی خدمات انجام دے رہی تھیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن مالوف میں حاصل کی۔ اور تکمیل کیلئے بغداد جو اس وقت علم وفنون کا ایک عظیم مرکز تھا، کی جانب عازم ہوئے۔ والدہ ماجدہ نے باوجود بیوہ ضعیف العمر اور بے سہارا ہونے کے اپنے لختِ جگر کو اجازت مرحمت فرمائی تاکہ ان کا نورِ چشم علم دین حاصل کر کے خلقِ خدا کو راہ دکھا سکے۔ آپ نے بغداد کی عظیم درسگاہ نظامیہ میں داخلہ لیا۔ جناب شیخ ۴۸۸ھ کے ماہِ صفر میں بغداد وارد ہوئے۔ جب آپ بغداد پہنچے تو اسی سال امام غزالیؒ نے مدرسہ نظامیہ کی تدریس سے استعفیٰ دیا۔ اس طرح ۴۹۵ھ میں پچیس برس کی عمر میں آپ علوم ظاہری کی تکمیل سے فارغ ہو گئے۔ درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ ہفتے میں صرف تین دن وعظ کیلئے مقرر تھے۔ اتوار کی صبح کو خانقاہ میں وعظ فرماتے پھر منگل کی شام اور

جمعہ کی صبح کو مدرسہ میں اجتماع ہوتا تھا۔ آپ کی یہ تبلیغی خدمات ۵۲۱ھ سے شروع ہو کر ۵۶۱ھ یعنی پورے چالیس برس تک جاری رہی۔ چنانچہ دارالعلوم کی توسیع کیلئے ایک عمارت کی بنیاد بھی رکھی گئی جو ۵۲۸ھ میں مکمل ہوئی۔ اسی سال سے حضرت شیخ رح نے تعلیم و تدریس کا باضابطہ کام شروع کیا۔ آپ کے مدرسے میں تیرہ علوم کے اسباق ہوتے تھے۔ بغداد و عراق کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک کے طلباء بھی آپ کے دارالعلوم میں داخل تھے۔ ایک روایت کے مطابق آپ کی مجلس وعظ میں مشائخ وصوفیاء بکثرت تشریف لاتے تھے۔ علاوہ ازیں عراق کے دوسرے شہروں کے کئی مشائخ اور علماء سفر طے کر کے مجلس وعظ میں حاضر ہوتے تھے۔ جن میں شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر رح اور شیخ شہاب الدین سہروردی جیسے رعیانِ وقت بھی شامل تھے۔

سلاسل اربعہ کیلئے منبع فیض

فیوضات طریقت کے مسالک چار ہیں۔ مگر ان سب کیلئے منبع افاضات حضرت شیخ رح کا ہی آستانہ ہے۔ چنانچہ سہروردی، چشتی اور نقشبندی سلاسل کے مرکزی پیشواؤں نے حضرت غوث صمدانی رح کے بارے جن احساسات کا اظہار فرمایا ہے۔ ان میں سے سلسلہ سہروردی کے پیشوا کا بیان درج کیا جاتا ہے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی طریقہ سہروردیہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔ مجھے عہدِ تعلم میں فلسفہ و کلام سے از حد شفقت تھا۔ میرے چچا نجیب الدین مجھے شیخ عبدالقادر رح جیلانی کی خدمت میں لے گئے اور کہا یہ لڑکا فلسفیات کو نہیں چھوڑتا۔ اس پر شیخ نے مجھے آگے بلایا اور پوچھا بیٹا کون سی کتابیں پڑھ لی ہیں۔ اس کے بعد کا واقعہ خود انکے الفاظ میں سنیئے۔

ترجمہ: "پس آپ نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر پھیرا، چنانچہ جونہی ہاتھ اٹھایا کہ مجھے اس ذخیرہ کتب سے ایک لفظ بھی یاد نہ تھا۔ لیکن خدا نے میرے سینے میں علوم لدنیہ بھر دیئے"۔ ایک دن بغداد میں اپنی مجلس میں ارشاد فرمایا "بفضلہ تعالیٰ میرا قدم اولیاء کے کندھوں پر ہے"۔ تو مجلس میں حاضر ہونے والے بیسیوں مشائخ نے اٹھ کر آپ کا قدم مبارک اپنے کاندھوں پر لے لیا۔ جن میں شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر اور شیخ

شہاب الدین سہروردی بھی شامل تھے۔ علاوہ ازیں دور دراز کے علاقوں کے اولیا نے اپنے اپنے مقامات پر اسی وقت گردنیں جھکا کر سرکارِ بغداد کے اس اعلان کو تسلیم کیا۔ چنانچہ شیخ حیات بن قیس حیرانی حرّان میں جُھک گئے۔ شیخ ابو مدین مغرب میں، شیخ عبدالرحیم قنا میں، شیخ عدی بن مسافر بالس میں، شیخ سوید سنجار میں، شیخ احمد بن رفاعی ام عبیدہ میں، شیخ عبدالرحمٰن طفسونج میں اور شیخ محمد بن موسیٰ بصرہ میں سرِ تسلیم خم ہو گئے۔

اسی طرح   کے تین سو تیرہ اولیاء اللہ نے اس فرمان کے احترام میں اپنے سر جھکا دیئے۔ ۶۰ اولیاء عراق عرب میں، ۴۰ عراق عجم میں، ۱۷ حرمین شریفین میں، ۳۰ شام میں، ۲۰ مصر میں، ۲۷ مغرب میں، ۲۳ یمن میں، ۱۱ حبشہ میں، ۳۷ سکندری میں، ۷ سراندیپ میں، ۴۷ جبل قاف میں اور ۲۵ جزائر بحرِ محیط میں جبین نیاز جھکانے والوں میں شامل تھے۔

آپ کی تعلیمات و شخصیت کے اثرات

آپ کے زمانہ میں ہی آپ کے خلیفہ حضرت عبدالقاہر اور ان کے بھتیجے حضرت شہاب الدین سہروردیؒ نے عراق و عرب کے علاقہ میں لوگوں کو دینِ حق کی طرف بلایا۔ اندلس میں حضرت عمار بن یاسر اندلسی (خلیفہ حضرت عبدالقاہر) حضرت ابو مدین مغربیؒ، حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ اور دیگر حق پرستوں کی بدولت توحید پرستوں کی سلطنت قائم ہوئی۔ بعد ازاں حضرت عمار بن یاسرؒ کے خلیفہ حضرت نجم الدین کبریٰؒ کے سلسلۂ ارادت سے حضرت شمس الدین تبریزیؒ اور مولانا فخر الدین رازیؒ جیسے علماء و فضلاء نے دنیا میں روشنی پھیلائی۔ حضرت شیخؒ کے روحانی شاگرد حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے اسلام کے اس پودے کی آبیاری کی، اور یہ ایک تناور درخت بن گیا۔ بعد ازیں غوری خاندان کی ہندوستان میں حکومت قائم ہوئی۔ اور کئی صدیوں تک برِ اعظم پاک و ہند میں مسلمان حکومت کرتے رہے۔ حضرت خواجہ الہندؒ اور حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلفاء حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شاہ رکن الدین عالم ملتانیؒ، سید جلال الدین بخاریؒ اور حضرت شہباز قلندرؒ نے لوگوں کو رشد و ہدایت کی دولت سے نوازا اور سلسلہ سہروردیہ کو فروغ حاصل ہوا۔

مدرسہ نظامیہ بغداد کا دوسرا سرپرست اور پرنسپل

مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت غوث الاعظم سید محی الدین عبدالقادر جیلانی ؒ کے بعد محرم ۵۲۵ھ میں المقتفی الامراللہ کی اجازت سے ابونجیب القاہر کو نظامیہ یونیورسٹی کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ آپ ایک زمانہ تک علم شریعت اور علم طریقت کی ترویج و اشاعت میں مشغول رہے۔ پھر ایک وسیع سرائے اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ آپ نے وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی قائم کیا۔ اور آپ کی مجلسِ وعظ میں سینکڑوں بندگانِ خدا نے اپنے گناہوں اور بدکرداروں سے توبہ کی۔ یہ مدرسہ طلباء کا دارالعلوم ہونے کے ساتھ ساتھ فقر و تصوف کی بہت بڑی تربیت گاہ بھی تھی۔ گویا علمی زندگی کے بیان میں آپ اسے مدرسہ کہہ لیں مگر روحانی زندگی کے ذکر میں اُسے صوفیاء کی خانقاہ کہیں، مدعا یہ ہے کہ فقراء اور صوفیاء کی جماعتیں آپ کے ہاں زیرِ تربیت رہتی تھیں۔ بہت سے اولیاء اور مشائخ اپنے علاقوں سے وقتاً فوقتاً حاضرِ خدمت ہوتے رہتے تھے۔ جن میں وزیران، نہروان، بارزان، موصل، عراق عرب، عراق عجم اور سرزمینِ شام تک کے لوگ شامل ہوتے نظر آتے بیان کیے جاتے ہیں۔ جب آپ مدرسہ نظامیہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ تو آپ کو "مفتی العراقین" کا معزز لقب دیا گیا۔ حقائق و معارف میں آپ کا کلام عالی ہوتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ تصوف کی ابتدا، علم وسط عمل اور اس کی انتہا بخشش ہے۔ کیونکہ علم سے مقصود منکشف ہوتا عمل مطلب میں معین بنتا اور بخشش عنایت مقصود تک پہنچاتی ہے۔

آپ ۴۹۰ھ بمقام سہرورد پیدا ہوئے۔ تہتر سال کی عمر یعنی ۷ جمادی الثانی بروز جمعہ ۵۶۳ھ کو آپ کا وصال ہوا۔ دوسرے دن صبح کو حضرت کا جنازہ اٹھایا گیا۔ اور آپ کو رباط (مدرسہ) میں دفن کیا گیا۔ آپ کا مزار مبارک بغداد میں مرجع خلائق ہے۔

آپ کی مشہور تصنیف عربی میں آداب المریدین ہے۔ جس کی شرح حضرت مخدوم جہاں ؒ نے بھی کی ہے۔ جو شرح آداب المریدین کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کے مشہور خلفاء اور مریدین میں حضرت نجم الدین کبریٰ ؒ، شہاب الدین سہروردی ؒ، حضرت عمار یاسر ؒ، شیخ اسماعیل قصری ؒ، روز بہان مصری ؒ، عبداللہ مطر رومی ؒ وغیرہم ہیں۔ اپنے پیر و مرشد کے بعد حضرت عمار یاسر ؒ بھی مدرسہ نظامیہ میں درس و تدریس کے فرائض تاحیات

انجام دیتے رہے۔ یہ مقام صدیوں تک علم شریعت اور علم طریقت کا مرکز بنا رہا۔

ماخذ

نفحات الانس، مناقب الاولیاء، تذکرہ ابونجیبؒ، اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیاء، بہجۃ الاسرار ص ۲۳، سیرت سیدنا غوث الاعظمؒ از نور بخش توکلی نوری بک ڈپو لاہور ۱۹۶۶ء، سیرت غوث اعظمؒ از مولانا نور احمد امرتسری۔

تحریر!
میاں اخلاق احمد ایم اے
۳۳۳ر شاد باغ لاہور
۱۷ر دسمبر ۱۹۸۶ء

بقیہ۔ شیخ الاسلام اور موسیقی

لیکن امیر خسروؒ سب کچھ ہونے کے باوجود شیخ الاسلام بہاؤالدین زکریاؒ جیسے اکابر اولیاء اللہ کی صف میں کھڑے ہونے کی جسارت نہیں کر سکتے۔

ہر درویش کا اپنا مقام ہے۔ جو مرتبہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل تھا قطب الاقطاب شاہ رکن عالم علیہ الرحمۃ کو حاصل نہیں اور جس مقام پر حضرت شاہ رکن عالمؒ فائز تھے۔ وہ بعد میں آنے والوں کو نصیب نہیں ہوا۔ اولیاء اللہ کے معاملے میں ہمیں اتنی جسارت سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

بکارے چرا دست باید کشید
کہ از دین و دنیا تواند بُرید

حضرت شیخ الاسلام بہاؤالدین زکریاؒ اور موسیقی[1]

—— نور احمد خاں فریدی ——

حضرت شیخ الاسلام سہروردی سلسلہ کے شیخ الکل تھے۔ سماع نہ خود سنتے تھے اور نہ ان کی خانقاہ میں کسی دوسرے کو سننے کی اجازت تھی۔ حضرت مولانا فخر الدین عراقیؒ کو، جو حضرت کے داماد اور خلیفہ تھے۔ محض اس بناء پر خانقاہ سے نکلنا پڑا تھا کہ جب ان پر جذب و سکر کی حالت طاری ہوتی تھی، تو وہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اشعار کی صورت میں کرنے لگتے تھے۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ موسیقی سے نہ تو شیخ الاسلام کو دلچسپی تھی اور نہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی محفل سماع کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ حضرت شیخ الاسلام صحیح معنوں میں وارث نبوتؐ تھے اور شریعت پر سختی سے پابندی تھے۔ پروفیسر محمد شفیع مرحوم جب حضرت شیخ الاسلام کے احوال و آثار پر مقالہ مدوّن کرنے لگے تو انہیں عبداللہ قوال کے اس واقعہ سے سخت دھوکہ لگا اور انہوں نے محمد کرم امام خاں نایک کی کتاب "معدن الموسیقی" کے حوالے سے لکھا ہے:۔

"امیر خسروؒ کی طرح آپ نے بھی اس علم کے بہت سے راگ بنائے۔ چنانچہ منجملہ ان کے دھناسری میں ملتانی ملا کے ملتانی دھناسری کیا اور پوربی و دلسکار ملا کے بہادرے نام رکھا۔"[2]

پروفیسر محمد شفیع مرحوم بڑے فاضل انسان تھے۔ تحقیق و تجسّس ان کا خصوصی میدان تھا۔ اورنٹیل میگزین میں انہوں نے بڑے معلوماتی مضامین لکھے اور بہت سی غلط روایات کی تکذیب کی۔ حضرت شیخ الاسلام کے متعلق ان سے جو غلطی ہوئی۔ اس سے ان کی عالمانہ صلاحیتوں پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ سہو اور نسیان انسان کا خاصہ ہے۔ وہ بہت بڑے عالم اور محقق ہونے کے باوجود بھی ایک انسان تھے۔ اگر ان فقرات کا انتساب وہ کسی دانشور اور ادیب سے کرتے

لے (۱) علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل (الحدیث) (۲) الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ

ٹے مقالہ شیخ الاسلام بہاءالدین ذکریا، از پروفیسر محمد شفیع پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور، ص ۲۱۔

لے یہ مضمون مولانا نور احمد خان فریدی مدظلہ کی کتاب "تذکرہ حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ" ... لاہور کے

تو ہم قطعاً بحث میں نہ پڑتے مگر یہاں تو معاملہ ایسی سرکار کا ہے جو لاکھوں اور کروڑوں کا مقتدا ہیں ۔ اگر آج یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت شیخ الاسلام نے راگ اور سُر ایجاد کئے تھے تو مصر سے فلپائن اور جاوا سماٹرا تک کروڑوں گھروں میں طبلے کھڑکنے لگیں گے اور ہر وہ شخص جو سہروردی سلسلے میں داخل ہے ۔ بجائے رکوع و سجود کے ٹھمریاں گانے لگے گا ۔ اس لئے ہم مجبور ہو گئے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام کی پاک ذات کو اس آلائش سے ملوث نہ ہونے دیں

پروفیسر محمد شفیع نے عبداللہ قوال کے واقعہ میں ایک لفظ کا اضافہ کر کے صحیح صورتحال کو مسخ کر دیا ہے کہ جب عبداللہ قوال نے عرض کی کہ (آپ کے مرشد) شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے میری خوش الحانی سنی ، آپ بھی سنیں ۔ یہاں تک تو صحیح ہے لیکن آگے جو فقرہ آپ نے لکھا ہے ، وہ غلط ہے ۔ فرماتے ہیں ۔ " چنانچہ ایک شب مجلس سماع منعقد کی گئی "[لے] اس کا مطلب تو سوائے اس کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ خانقاہ عالیہ کے اندر حضرت نے عبداللہ قوال سے سماع سننے کا خصوصی انتظام کیا ۔ شامیانہ نصب ہوا ۔ دریاں اور غالیچے بچھائے گئے ۔ چراغاں ہوا ۔ مجلس میں حضرت اپنے صاحب زادوں پوتوں ، اکابر خلفاء ، زکریا یونیورسٹی کے اساتذہ ، سلطان ناصر الدین قباچہ فرماں روائے ملتان اور روسائے شہر کے ساتھ قرینے سے تشریف فرما ہوئے اور پھر عبداللہ نے اپنے کمالات کا مظاہرہ شروع کیا ۔

آپ کسی بھی مبصر سے دریافت کر لیں ، وہ " ایک شب مجلس سماع منعقد ہوئی " کا یہی مطلب لے گا ۔ مگر حاشا و کلاّ ، صورت حال ایسی نہیں ہے ۔ عبداللہ کا اپنا بیان ہے کہ " مجھے اور میرے رفیق کو حجرے میں پہنچا دیا گیا ۔ عشاء کی نماز کے بعد جب حضرت شیخ الاسلام اوراد سے فارغ ہوئے ، تو تنہا حجرے میں تشریف لائے اور بیٹھ کر تقریباً نصف پارہ قرآن کا تلاوت فرمایا ۔ اس کے بعد اٹھ کر حجرے کے دروازے میں زنجیر لگا دی ، اور مجھے فرمایا ۔ " ہاں شروع کرد "۔ کیا اس واقعہ پر مجلس سماع کے " انعقاد " کی تطبیق ہو سکتی ہے ۔

امر واقعہ یہی ہے کہ حضرت نے عبداللہ سے سماع سننے پر آمادگی کا اظہار اس لئے

لے ، مقالہ شیخ الاسلام ، از پروفیسر محمد شفیع مرحوم ، صفحہ ۲۱

فرمایا کہ اس کے قول کے بموجب حضرت کے مرشد کریم سُن چکے تھے۔ پھر عبداللہ اور اس کے رفیق کو تنہا ایک حجرے میں بیٹھنے کا حکم دیتے ہیں۔ خود عشا کی نماز کے بعد کافی دیر تک اوراد میں مصروف رہتے ہیں۔

جب یہ یقین ہو جاتا ہے کہ خانقاہ اور مدرسہ کے لوگ سو گئے ہوں گے تو حجرے کا رُخ کرتے ہیں۔ اندر داخل ہو کر خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں اور نصف پارہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی خادم یا درویش صحن خانقاہ میں چل پھر رہا ہو، تو آپ کے فوراً ادھر تشریف لانے کے سبب تجسس حال کی کوشش نہ کرے۔

حضور اسی پر قناعت نہیں فرماتے اور پھر کھڑے ہو کر حجرے کے دروازے پر زنجیر لگا دیتے ہیں تاکہ اگر کوئی آنا چاہے تو نہ آسکے۔

عبداللہ کو حکم ہوتا ہے، شروع کرو،

بات یہاں پر ختم ہوتی نہیں۔ حضور کھڑے ہو کر چراغ کو بجھا دیتے ہیں۔ حجرے میں گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے۔

عبداللہ کا اپنا بیان ہے کہ ہم لوگ تاریکی میں اسی طرح گاتے رہے۔ صرف اس قدر معلوم ہوتا تھا کہ شیخ الاسلام جنبش اور حرکت کر رہے ہیں لیکن تاریکی کی وجہ سے یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ ضرب پر حرکت کرتے ہیں یا بغیر ضرب۔ جب سماع ختم ہوا، تو حضرت نے دروازہ کھول دیا اور حجرہ سے باہر تشریف لے گئے۔

عبداللہ کہتا ہے؛

"صبح کو شیخ الاسلام نے خادم کے ہاتھ خلعت فاخرہ اور بیس اشرفیاں بھجوادیں"۔

اور عبداللہ ملتان سے اجودھن کو رخصت ہوگیا۔

عبداللہ جب اجودھن اور دہلی کے سفر سے واپس آیا، تو حضرت نے پھر اس سے کچھ سنانے کی فرمائش نہیں کی اور نہ ہی خانقاہ کے کسی درویش، حتیٰ کہ عراقی نے اس سے سماع سننے کی جسارت کی اور نہ ہی آپ کے صاحبزادوں اور اکابر خلفاء نے اسے منہ لگایا۔ کیا اس ماحول میں "دھنک دھیا" کو راہ مل سکتی ہے اور اس خانقاہ کا نگران اعلیٰ راگ اور سُر ایجاد کر سکتا ہے۔

موسیقی کے ماہر مخدوم بہاؤالدین برناوی تھے،

نہ کہ حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ

دراصل جنہوں نے راگ اور سر ایجاد کیے تھے۔ وہ مخدوم بہاءالدین برناوی تھے۔ فقیر اللہ نے راگ درپن میں اور محمد کرم امام خاں نائیک نے انہی کا ذکر کیا ہے۔ خود مولوی محمد شفیع مرحوم نے بحیثیت مدیر رسالہ "اورنٹیل میگزین" کی اشاعت نومبر ۱۹۲۷ء[1] میں مخدوم بہاؤالدین برناوی پر ایک تفصیلی مضمون شروع کیا تھا۔ اس کی تیسری قسط میں آپ نے مخدوم صاحب اور ان کے منظور نظر قوال "محبت" کے بارے میں یہ عبارت درج کی تھی۔

(مخدوم بہاؤالدین برناوی) کے ہاں ایک قوال "محبت" نامی سرانہ کا متوطن تھا۔ وہ نسبتاً اور قوالوں کے زیادہ مستعد اور ذکی تھا۔ شعر دانی اور کبیری میں اپنے اقران پر ممتاز تھا۔ اس کی آواز بڑی رسیلی تھی۔ حتیٰ کہ امراء و سلاطین میں بھی مشہور ہوگیا تھا۔ ایک دن بیداری کے پردے میں ایک خیال آپ (مخدوم صاحب) نے موزوں کیا اور قوالوں کو سکھانے لگے۔ ان میں محبت قوال بھی موجود تھا۔ وہ ہندوستانی قیدی تھے۔ جس میں ایک ایسا مشکل نکتہ آگیا تھا کہ قوال اس کو ادا نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے محبت کو ملامت کی کہ میاں تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ راگ اور تان کے ادراک میں تمہارے متعلق لوگوں کا اس قدر اعلیٰ خیال ہے اور یہ ذرا سی پیچیدہ چیز نہیں سمجھ سکتے۔ آخر محبت نے محنت کر کے اس راگ کو ادا کر دیا اور برابر ایک ماہ تک اس کی مشق کرتا رہا۔

جب مولوی محمد شفیع مرحوم کا مقالہ میری نظر سے گزرا۔ میں نے مرحوم کے صاحبزادے مولوی احمد ربانی صاحب کو لکھا کہ موسیقی کا انتساب حضرت شیخ الاسلام زکریا ملتانی سے قطعاً غلط ہے۔ یہ چیز حضرت کے مسلک کے خلاف ہے۔ اگر آپ یہ مقالہ دوبارہ شائع کرائیں تو اس روایت کی تردید کر دیں۔ جس سے انہوں نے اتفاق نہیں کیا۔ اور لکھا

---

[1] اورنٹیل میگزین، لاہور۔ بابت نومبر ۱۹۲۷ء

جناب احمد ربانی صاحب اپنے والد کے نہایت سعادت مند فرزند ہیں۔ خدا تعالےٰ ایسی اولاد ہر شخص کو نصیب کرے۔ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے والد ماجد سہو اور نسیان سے پاک تھے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ پتھر کی لکیر ہیں اور عین صواب ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے تحریر فرمایا!

"شیخ الاسلام بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بڑی تحقیق کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد اگر یہ معلوم ہو کہ انہیں راگ سے دلچسپی تھی تو یہ ان کی بڑائی ہے ورنہ آپ حضرت داؤد علیہ السلام، خسروؒ، حضرت شیخ الکبیر فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کو کیا کہیں گے؟"

ہمیں بھی اس سے اتفاق ہے کہ شیخ الاسلام کا مقالہ مدوّن کرنے میں ان کے والد مرحوم نے خاصی محنت کی ہے، لیکن اس امر کے اعلان میں ہمیں قطعاً باک نہیں کہ موسیقی کے معاملے میں ان کے والد ماجد کو سخت دھوکہ ہوا ہے۔ اگر ان کے نزدیک راگ میں دلچسپی عظمت کی نشانی ہے تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام کی ذات گرامی اس عظمت و شوکت سے پاک تھی۔

بے چارے فقیر اللہ اور محمد اکرم امام خان نایک کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ ہم بھارت کے جس مخدوم بہاؤالدین کا ذکر کر رہے ہیں۔ آنے والے دور کے محققین اسے حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا سمجھ لیں گے۔

میں نے جناب احمد ربانی صاحب کو لکھا کہ آپ نے راگ کے سلسلے میں حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ ہم لوگ داؤدی شریعت کے پیرو نہیں۔ حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مطہرہ کے متبع ہیں۔ نیز حضرت فرید الدین مسعود شکر گنج علیہ الرحمۃ کا معاملہ جدا ہے۔ آپ چشتیہ سلسلہ کے بزرگ تھے۔ ان کے مسلک میں سماع مباح تھا۔ وہ سنتے تھے۔ اس سے ان کی روح کو وجد آتا تھا اور سکر کا عالم طاری ہو جاتا تھا، مگر نہ تو انہوں نے کوئی راگنی ایجاد کی۔ (معاذ اللہ) اور نہ ہی خود کسی مجلس میں سُر اور تان سے غزل گا کر سنائی۔

باقی رہا حضرت امیر خسروؒ کا معاملہ، تو وہ متعدد سلاطین کے مصاحب اور منصب دار رہے ہیں اور اپنے دور کے امیر کبیر تھے۔ ساتھ ہی فقراء اور درویشی سے بھی بہرہ وافر رکھتے تھے



ادارہ سہروردیہ فی مخزن علوم اسلامیہ

کی مطبوعات

مشائخین سہروردیہ

مؤلفہ: صوفی محمد نذیر غوری ہجویری سہروردی

قیمت: ۱۰ روپے

سیاح لامکاں

مؤلفہ: شیخ الاسلام حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی رح

قیمت: ۱۰ روپے

دختر ملّت

مؤلفہ: شیخ الاسلام حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی رح

(مفت تقسیم کیلئے)

MUHAMMAD MEETS THE CREATOR

(ترجمہ: سیاح لامکاں)

مترجم: محمد انور

(زیر طبع)

ملنے کا پتہ: ۸۱ - کراچی بلاک - اعظم کلاتھ مارکیٹ، لاہور